دِن کا اَسرار*

خواب کے ڈھلانوں پر
دائرے عُمودی سب
اور سُکوت کے پہرے
شام کے رواں چہرے
لہجہ لہجہ انجانے
مُنجمد تناظر میں
جہت ہر نئی برزخ
بے زبان چوراہے
جسم و روح سے خالی۔
مسخ ہوتی جاتی ہے
بحر و بر کی سرگوشی
سانس کی سُبک دوشی
رمز کے سُتونوں کی
بے نوا قطاروں میں
سوئے آبشاروں میں
کس کے پُرجُنوں سایے
جِھلملا اُٹھے ہیں یہ ؟
خواب کے دروں کو اب
کچھ ذرا بدل جاؤ
آنکھ کے سمندر کی
تھاہ سے نکل جاؤ
بے ثبات رنگوں کے
لمس میں پگھل جاؤ!

* شہرۂ آفاق یونانی اطالوی مصوّر Giorgio de Chirico (1888-1978) کی تصویریں اس نظم کی محرّک بنیں۔ Chirico کی مصوّری کی فرسودہ اَسرار آمیز فضا کے نکات سے (جس نے Surrealism کو بہت حد تک متاثر کیا) اِس نظم کو ہم کنار کرنے کی کوشش کی ہے۔

خدشہ

نکالے ہی جائیں گے
گھر سے، نگر سے
بدن سے،
جہاں سے،
فضاؤں کی اُجڑی حویلی سے باہر
ستاروں کی رخشاں ہتھیلی سے باہر
جنم کے مسلسل بیابان میں ہم
زمانوں کی ریتوں کو دِل میں سمیٹے
سُرنگِ نفی میں نکل تو پڑے ہیں
ہم اپنے شجر کو، گیھا کو سمیٹے
تمدن کے خوں سے اُبل تو پڑے ہیں
اُڑانوں کی زد سے پھسل تو پڑے ہیں
سماعت، تناظر، تصور سے باہر
اندھیروں سے باہر
شعاعوں سے باہر
فناؤں سے باہر
بقاؤں سے باہر
نکالے ہی جائیں گے ہم، اِک نہ اِک دِن
کسی ننگے امکاں کی پھیلی زمیں پر
جہاں ہجرتوں کا عجب رنگ ہوگا
فلک وسعتوں کا
بہت تنگ ہوگا۔

عُروج

زمینوں کے
سیّال اَسرار میں
جی رہا ہوں۔
وہیں سے
فناساز موجوں کی
ناآفریدہ زباں سے
اُبھر کر
بس اب قطرہ قطرہ
فلک پی رہا ہوں۔

چیونٹی

پھیلی سمٹی
آڑی ترچھی
ہستی چلتی پھرتی میری
دیوانے بِپھرے جسموں کی ایک قطار۔
لمحہ لمحوں کی مانند یہاں
آنا جانا پانا اور کھو جانا ہے
اِک پل مِٹنا اور اِک پل ہو جانا ہے۔
چلتے پھرتے فکر یہی ہے
ذرّہ بھر یہ جسم اُٹھائے
شکّر کے دانے جیسی
دُنیا سے اور اُلجھنا کیا؟
ذرّہ بھر یہ جسم اُٹھائے
اپنی ہی بانہوں کی زد پر
کیا جانے کیا کیا کھویا ہے ؟
کیا جانے کیا ڈھونڈ رہی ہوں
نقطہ نقطہ ویرانوں میں
وحشی ہاتھی کے کانوں میں!

چلتے پھرتے سوچ رہی ہوں
تِنکا بھر طُوفان اُٹھا کر
بُوند کی سیلابی آنکھوں میں
غوطہ ایک لگانا ہوگا
آنسُو کے بھیگے ساحل پر
آج فنا ہو جانا ہوگا۔

وَینِس (Venice)

پہنا کے زنجیر آبی نباتات کی
اب بھی جکڑے رکھا ہے مجھے پانیوں نے۔
نفس میرا پانی
مری روح پانی
مرے عکس کی لہر در لہر سطحوں میں
سیّال پتوار کھولے ہیں
در اور دریچوں کی تاریخ نے۔
مُرتعش مُرتعش
اپنی پھیلی رگوں کی فراوانیوں میں
بہاتا ہوں مَیں نغمہ زن کشتیوں کے چراغ۔
آسمانوں کا آئینہ سر پر لیے
پھڑ پھڑاتے کبوتر کی دس لاکھ حیرت بھری
سُرخ آنکھوں سے چکرا کے گِرتے ہوئے
ہر کلیسا محل اور فُندق کے
سبز اور آلودہ محراب و گنبد بھی پانی !

عیاں میرے سینے کے سیّال آفاق پر
صحن تا صحن کچھ فاختاؤں کے شہپر
تمدّن کے تیور
ہَوا کے سُتوں در سُتوں سارے سیّاح پیکر
گُھلے ہیں زمانوں سے پانی کی گلیوں میں
تاجِر جہازوں کے زرخیز پھیرے !
مگر ساری آرائشوں میں سما کر
سرابوں کی موجوں کے غیبی تھپیڑوں نے
پل پل نکھارا ہے بوسیدہ چہرے کو میرے۔
تو اپنے ہی نم اور خوابیدہ سایوں کے
افسانے کہتے ہوئے اب
مُسلسل روانی کے کاندھوں پہ رہتے ہوئے اب
تغیّر کا طُوفاں اُٹھاؤں تو کیا ہو؟
تری آنکھ میں ڈوب جاؤں تو کیا ہو؟